OPEN ACCESS: Al-Aijaz Research Journal of Islamic Studies & Humanities
ISSN (ONLINE): 2707-1219 www.arjish.com ISSN (PRINT): 2707-1200

اُردو ناول میں علاقائیت کی شناخت: تنقیدی جائزہ

A Critical Analysis of Regional Identity in Urdu Novel

Waseem Abbas Gul
Lecturer Urdu, Ghazi University, Dera Ghazi Khan.
Email: waseemabbasgul786@gmail.com

Farwa Aisha
PhD, Scholar Urdu, GCU, Faisalabad.
Email: sassigurmani@gmail.com

Dr. Rafia Malik
Assistant Professor Urdu, NCBA&E, Multan
Email: rafiamalik7151@gmail.com

Received on: 02-02-2022 Accepted on: 05-03-2022

Abstract

Urdu language and literature are considered essential source of human knowledge, during the history of Urdu language structure in India before the beginning of the novel. When scholars used to write naval, there was a unique literary condition in Sub-continent very some to English literature in Europe. The scholars tried to explore the human environment with a sowed change in society. It democratic norms started to develop. The world has become changed in different reasons and literary work played a role, therefore, South Asia moved as a part of under literature and promoted the regional aspects of literature. This research paper his show list and explore the role regard aspects of identity in literature true in south Asia.

Keywords: Urdu, Naval, Region, India, Literature Society, etc.

تعارف

اُردو ناول کی تاریخ پر نظر ثانی کی جائے تو ہمیں ناول کے وجود میں آنے سے قبل کے حالات معلوم ہو جائیں گے۔ جس وقت اردو ادب میں ناول کی صنف پر طبع آزمائی کی گئی اس وقت ہندوستان کے حالات منفرد تھے۔ ہندوستان میں بھی تقریباً وہی حالات رونما تھے جو کم و بیش انگریزی ادب میں ناول کے آغاز کے وقت یورپ میں تھے۔ انسانی زندگی کو قسمت نہیں بلکہ اس کے ارد گرد کا ماحول اور فضا بدل رہی تھی۔ انسانی ذہن پرانی بندشوں کو توڑ کر آزادانہ طور پر اپنے خیالات کا اظہار کرنے کی کوشش کرنے لگا تھا۔ جمہوریت کی طرف اس کا رجحان بڑھنے لگا۔ حکمرانوں اور جاگیرداروں کے آگے گھٹنے ٹیکنے کے بجائے ان کے خلاف احتجاج کے نعرے بلند ہونے لگے۔ متوسط طبقے کے لوگوں کو سماجی، سیاسی اقتدار حاصل ہونے لگا۔ انھیں وجوہات کے سبب یورپ کے ممالک میں تیزی سے حالات تبدیل ہوئے۔ انقلابات رونما ہوئے۔ لوگوں نے بندشوں سے آزاد ہو کر جب کھلے آسمان میں اڑان بھرنے کی سوچی تو معاشرے پر اس کا سیدھا اثر پڑا۔ چونکہ ادب سماج کا آئینہ ہے

اس کی عکاسی کرتا ہے اس لیے ناول کی صنف کے ذریعے معاشرے کی اصلاح کے اقدام اٹھائے گئے۔

موضوع پر بحث

ادب کی دیگر اصناف کے مقابلے میں ناول کا دائرہ زیادہ وسیع ہوتا ہے اور کافی دلچسپ بھی کیونکہ اس میں فرد کی سماجی، سیاسی، مذہبی، تہذیبی، اقتصادی اور ازدواجی زندگی کی عکاسی کی جاتی ہے۔ یعنی ناول نگار اپنے عہد کے واقعات اپنے مشاہدات تجربات و نظریات، افکار و خیالات کو آپس میں ملا کر ایک خاکہ تیار کرتا ہے جو پڑھنے والوں پر گہرا تاثر چھوڑتا ہے۔ چونکہ قاری اور تخلیق کار دونوں ہی انسان ہیں۔ دونوں ہی اپنے گرد و پیش کا ماحول دیکھتے پرکھتے ہیں، محسوس کرتے ہیں لیکن ناول نگار ایک مخصوص نقطۂ نظر سے چیزوں کا مشاہدہ کرتا ہوا معاشرے کی تصویر کشی کرنے کی کوشش کرتا ہے اور بیک وقت اپنے نظریات بھی پیش کرتا ہے کیونکہ وہ اپنی نظر سے سوسائٹی کو دیکھتا ہے جس سے قاری ناول نگار کی شخصیت کو بھی اپنے روبرو پاتا ہے۔ انگریزی نقاد رالف فاکس ناول کی پیدائش کے بارے میں لکھتے ہیں:

''ناول فطرت سے بحث کرتا ہے۔ یہ فرد کی سوسائٹی اور فطرت کے خلاف جدوجہد کا رزمیہ ہے اور یہ اس سوسائٹی میں ترقی کر سکتا ہے جب کہ انسان اور سوسائٹی کے درمیان توازن ختم ہو گیا ہو، جبکہ انسان خود آدمیوں اور فطرت کے ساتھ برسرِپیکار ہو۔ ایسی سوسائٹی سرمایہ دارانہ سوسائٹی ہی ہو سکتی ہے۔'' (۱)

اس بابت انگریزی ادیب جے بی پرسٹلی کا کہنا ہے:

''ناول تیزی سے بڑھتے ہوئے غیر منظم طریقے پر پھیلتے ہوئے، بدلتے ہوئے غیر مربوط سماج اور ایسے حالات میں جن میں قدیم ساجی اور تمدنی نمونے تیزی سے ختم ہو رہے ہوں وجود میں آتا ہے اور وہ ایسے ہی سماج کو منعکس کرتا ہے۔'' (۲)

اُردو نقاد یوسف سرمست ناول کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار اس طرح کرتے ہیں:

''اگرچہ ناول کا لفظ اور اس کی ہیئت انگریزی ادب کے ذریعہ ہندوستان آئے لیکن اصل میں ہندوستان کے وہ مخصوص حالات تھے جنھوں نے یہاں کے ادیبوں کو ناول نگاری کی طرف راغب کیا۔ حقیقت میں یہ ایک ضرورت تھی کیونکہ کہانی ہر زمانہ میں ادب کی مقبول ترین صنف رہی ہے۔ اس مقبولیت کو پیشِ نظر رکھ کر ہندوستانی ادیبوں نے زندگی کی حقیقتوں اور اپنے خیالات کو قصوں میں سمونا شروع کیا۔'' (۳)

۱۸۵۷ء کے غدر کے بعد ہندوستانی عوام کے لیے غلامی کے ایک نئے دور کا آغاز ہو گیا تھا۔ مغلیہ سلطنت تقریباً اختتام پذیر تھی۔ انگریزوں نے ہندوستان پر پوری طرح اپنا سکہ جما لیا تھا جس کی وجہ سے یہاں نئی اقدار و روایات کی آندھی سی آئی جس نے علمی، تہذیبی اور ثقافتی سطحوں کو اثر انداز کیا۔ ساتھ ساتھ سماج کے ڈھانچے کو بھی متاثر کیا۔ ہندوستان کا سیاسی نظام کچھ اس طرح ہو گیا کہ عوام کی خاص کر مسلمانوں کی تہذیبی، تمدنی بصیرت محدود ہو کر رہ گئی تھی۔ علم و فکر کی راہیں دائروں میں سمٹ کر رہ گئی تھیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ لوگ مغربی چکاچوندھ میں اس قدر غافل ہو گئے کہ اخلاقی اور روحانی اقدار پامال ہونے لگیں۔ انگریزوں کے دو مقصد تھے۔ ایک یہ کہ ہندوستان کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لے کر یہاں حکومت کرنا اور یہاں کی ساری دولت لوٹنا، دوسرا یورپ کے اقتدار کو مستحکم بنانا تھا۔ یہاں کی عوام میں اتنی ہمت نہ تھی کہ

انگریزوں سے ٹکراتے اس لیے دھیرے دھیرے مغربیت کا غلبہ ہونے لگا۔ نئے خیالات، تصورات، میلانات اور نئی تہذیبی قدریں شعور ادب میں شامل ہونے لگے۔

ہندوستان میں یہی وہ افسوس کردہ حالات تھے جن میں نذیر احمد نے ۱۸۶۹ء میں اپنے پہلے ناول ''مراۃ العروس'' کے ذریعے ادب میں باقاعدہ طور پر اردو ناول کی صنف کا آغاز کیا۔ ان حالات کے پیشِ نظر جب اردو ناول نے اپنے ارتقاء کی طرف قدم بڑھائے تو نذیر احمد نے عہد کی ترجمانی کرنے کے بجائے مسلم معاشرے کی اصلاح کے لیے اقدامات اٹھانے ضروری سمجھے۔ اس وقت ہندوستانی معاشرے میں اخلاقی، مذہبی اقدار اس قدر پامال ہوچکے تھے کہ اسے ادب کے ذریعے اصلاح کرنے کے متعلق سوچنا پڑا۔

نذیر احمد کے ناول چاہے وہ ''مراۃ العروس'' ہو یا ''توبۃ النصوح''، ''فسانہ مبتلا''، ''ابن الوقت''، ''ایامیٰ''، ''رویائے صادقہ'' سبھی ناولوں میں سماجی مسائل پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ غرضیکہ کوئی بھی ناول ایسا نہیں ہے جس میں اس عہد کے مسلم گھرانوں کی عکاسی نہ کی گئی ہو۔ نذیر کے ناولوں کی اہم خصوصیت یہ ہے کہ وہ اپنے عہد کے مسائل کو موضوع بنا کر اپنے ناولوں کی بنیاد رکھتے ہیں۔ انھوں نے مافوق الفطرت واقعات کو نہ پیش کر کے ناول کو انسانی زندگی کا ترجمان بنایا۔ انھوں نے اس دور کے معاشرتی حالات کی حقیقی ترجمانی کرکے ناولوں کو زندہ جاوید بنا دیا۔

نذیر احمد کے زیادہ تر ناولوں میں معاشرتی پسِ منظر خیالی نہیں بلکہ حقیقی ہے۔ ناول کے ابتدائی دور میں انھوں نے ناول کی جو نئی روایات قائم کیں وہ ادب سے ان کی گہری وابستگی کو ظاہر کرتا ہے۔ ان کے زیادہ تر ناولوں میں مسلمانوں کی معاشرتی، تہذیبی زندگی کی اصلاح کرنے کا جذبہ طاری ہے۔ دیکھا جائے تو نذیر احمد کے زیادہ تر ناول سوشل ہیں کیونکہ انھوں نے کسی نہ کسی زاویہ سے اپنے عہد کے سماجی مسائل کو اٹھایا ہے اور ان کی اصلاح کی طرف توجہ دی ہے۔ ''فسانہ مبتلا'' کے دیباچے میں پروفیسر افتخار احمد صدیقی نے نذیر احمد کے ناولوں کو سوشل ناول کی قسم بتایا ہے۔

''سوشل ناول کی ایک قسم وہ ہے جسے گھریلو ناول کہتے ہیں۔ نذیر احمد کے سبھی ناول تقریباً گھریلو ناول ہیں اور اس اعتبار سے وہ اردو کے 'جین آسٹن' کہے جا سکتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ جس طرح 'جین آسٹن' کے ناولوں میں گھر کے ڈرائنگ روم یا معاشرتی زندگی کی تقریبات، پارٹیاں، ڈنر وغیرہ مرکزی حیثیت رکھتی ہیں اسی طرح نذیر احمد کے قصے بھی گھریلو زندگی کے ارد گرد گھومتے ہیں لیکن نذیر احمد نے ایک اصلاحی مقصد کے تحت گھریلو زندگی کی عکاسی کی ہے۔ اس مقصدیت نے ان کے ناولوں میں زندگی کا دائرہ وسیع کر دیا ہے اور جمہور کی معاشرتی زندگی کے اہم مسائل اور متعدد پہلو ان کے ناولوں میں سما گئے ہیں۔''(۴)

اس سے صاف ظاہر ہے کہ نذیر احمد کے ناولوں کا مقصد معاشرے کی اصلاح اور مسلم تہذیب کی پامال اقدار کو روکنا تھا۔ ان کے ناولوں میں اخلاقیات، معاشرت، تہذیب و تمدن کی جھلکیاں ملتی ہیں۔ ان کے ناولوں میں حقیقت نگاری کے علاوہ فنی اعتبار سے ناول کے دوسرے عناصر بھی ملتے ہیں۔ حالانکہ ان کے ناول ان کے عہد کی عکاسی کرتے ہیں لیکن پھر بھی جو باتیں ایک علاقائی ناول میں ہونی چاہیے وہ نذیر احمد کے

ناولوں میں دیکھنے کو نہیں ملتی۔

نذیر کے بعد شرر نے تاریخی ناول لکھے جن میں ہم تاریخ کی کئی زندہ ہستیوں کو جیتا جاگتا محسوس تو کرتے ہیں۔ان کا ناول دلچسپ ایک معاشرتی ناول ہے جس میں علی گڑھ شہر کی رومانیت بھری فضا پیش کی گئی ہے۔''فردوسِ بریں''، ''زوال بغداد''، ''حسن کا ڈاکو'' وغیرہ ان کے اہم ناول ہیں۔ان کے معاشرتی ناولوں کا ڈھانچہ قریب قریب یکساں ہوتا ہے جس کے بابت علی عباس حسینی فرماتے ہیں:

''تاریخی ناولوں کے علاوہ کوئی معاشرتی یا اخلاقی چیز پیش کرتے ہیں تو اس کے پلاٹ کا خاکہ ایک ہی طرح کا ہوتا ہے۔''(۵)

شرر کے ناولوں میں ہم ماضی کے کچھ مقامات، عمارات حکمرانوں اور اس عہد کے حالات، تہذیب و تمدن سے روشناس ہوتے ہیں لیکن ان ناولوں کی فضا تاریخی ہے اسی لیے ان ناولوں میں ہمیں علاقائیت کی شناخت کرنے میں دشواری پیش آتی ہے کیونکہ شرر کے ناولوں میں تاریخی عناصر تو موجود ہیں مگر انھیں علاقائی ناول کے زمرے میں شامل کرنے کے لیے اتنا کافی نہیں ہے۔

اُردو ناول میں باقاعدہ طور پر علاقائیت ہمیں پنڈت رتن ناتھ سرشار کے یہاں سے ملنا شروع ہوتی ہے۔ سرشار کو لکھنو کی معاشرت سے بے پناہ لگاؤ تھا جس کے باعث انھوں نے اپنی شہرہ آفاق تصنیف ''فسانہ آزاد'' میں اس کی عکاسی کی ہے۔ ''فسانہ آزاد'' سات ضخیم جلدوں پر مشتمل ہے۔ شرر نے لکھنؤ کی زندگی اور معاشرت کو نہایت قریب سے دیکھا تھا۔اس ناول میں انھوں نے لکھنو کی مخصوص طرزِ معاشرت کی حقیقی ترجمانی کرنے کے ساتھ ساتھ لکھنؤ کے ایک خاص عہد کی زوال آمادہ تہذیب کی عکاسی کی ہے۔اس ناول میں سرشار کا انداز بیان ظرافت نما ہے۔انھوں نے لکھنؤ کے مسلمانی معاشرے، ہر طبقے اور ہر پیشے کو بخوبی پیش کیا ہے کہ ناول بالکل حقیقی اور فطری معلوم پڑتا ہے۔

وقار عظیم نے اپنے مقالے میں سرشار کے ناول کے متعلق رقمطراز ہیں:

''سرشار اُردو کے پہلے ناول نگار ہیں جنھوں نے زندگی کے پھیلاؤ اور اس کی گہرائی پر احاطہ کرنے کی طرح ڈالی اور اُردو ناول کو ایک ایسی روایت سے آشنا کیا جسے فنی عظمت کا پیش خیمہ اہیے۔ سرشار نے لکھنؤ کے معاشرہ کو اپنا موضوع بنایا اور اس موضوع کو منتخب کر لینے کے بعد اس بات کو اپنا منصب جانا کہ معاشرہ کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کے ہر پہلو کی اس طرح مصوری کریں کہ دیکھنے والے ان سب کو جیتا جاگتا اپنی آنکھوں سے دیکھ سکیں۔''(۶)

سرشارؔ کے اس ناول میں واقعی ہمیں لکھنؤ کی مخصوص تہذیب دیکھنے کو لاتی ہے۔ وہاں کے لوگ، ان کی گفتگو کا انداز، خاص طرز معاشرت سے ہم روبرو ہوتے ہیں۔

سرشارؔ کے بعد کئی ناول نگاروں کے ناول منظر عام پر آئے لیکن ان میں علاقائی شناخت کرنے کے لیے کوئی اہم نقطہ موجود نہیں ہے۔

اس کے بعد ہمیں ناول ''امراؤ جان ادا'' میں علاقائیت کا جزو دیکھنے کو ملتا ہے۔ مرزا محمد ہادی رسواؔ نے یہ ناول لکھ کر اُردو ناول کی تاریخ میں گراں قدر اضافہ کیا کیونکہ یہ باقاعدہ طور پر پورے اجزائے ترکیبی کے ساتھ اُردو کا پہلا ناول تھا اور اس میں انھوں نے ایک طوائف کے کوٹھے کے ذریعے سماج کے مختلف طبقات کے لوگوں کی ذہنیت، ان کے عادات واطوار سے متعارف کرایا، کیونکہ طوائف کا کوٹھا ایک ایسی جگہ

ہے جہاں نوجوان، بوڑھے، امیر و غریب، نواب، سلطان، ڈاکو، عالم، جاہل سبھی طرح کے لوگ آتے ہیں اور اپنے طبقے کی خصوصیات سے ہمیں روشناس کراتے ہیں۔ امراؤ جان کے ذریعے ہم اس عہد کے لکھنؤ اور فیض آباد کی فضا، حالات، سماجی و سیاسی صورت حال سے واقف ہو پاتے ہیں۔ رسوآ نے اس ناول میں اس وقت کے لکھنؤ کی تہذیب، رسم و رواج، عقائد، عام بول چال کی زبان، نوابین و سلاطین کے گھرانوں کا رہن سہن اور لکھنؤ کی زوال آمادہ تہذیب کے مرقعے پیش کیے ہیں۔ بقول احتشام حسین:

''رسوا نے ایک طوائف کی زبان سے سب باتیں کہلوائیں جو ایک بحران میں مبتلا کر دیتی ہیں۔۔۔۔۔ جس لکھنؤ کو وہ جانتے تھے اس کی زندگی کے سب پہلوؤں کو بچے فنکار کی طرح سامنے لا کھڑا کیا ہے۔۔۔۔ اس بات پر سبھی اہم نقاد متفق ہیں کہ حقیقت پسندی کے اعتبار سے یہ اردو کے اہم ناولوں میں سے ہے۔ ایک طوائف کی تصویر کے پیچھے ہر طبقے کے لوگ کھڑے دکھائی دیتے ہیں اور وہ لکھنؤ ہمارے سامنے آ جاتا ہے جو اُنیسویں صدی کے آخر میں دم توڑ رہا تھا۔ اس وقت کی تہذیب، ادبی زندگی اور مذہبی حالات، دیہاتوں کی معاشی بدحالی اور لوٹ مار کے علاوہ جذبۂ محبت کے بے نظیر نقشے بھی اس ناول میں ملتے ہیں۔''(۷)

اس ناول کا بغور مطالعہ کیا جائے تو یہ اندازہ ہوتا ہے کہ رسوا نے لکھنوی تہذیب کا حسین امتزاج پیش کیا ہے۔ علاقائی اعتبار سے دیکھا جائے تو اس ناول میں یوپی کے مرکز لکھنو کی تہذیب و تمدن کا جیتا جاگتا منظر ملتا ہے۔ ناول کو پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ واقعی اس علاقے کی ہو بہو تصویر ہے۔ اس بابت خورشید الاسلام لکھتے ہیں:

''فیض آباد کے کسی محلے میں نوابین اور بیگمات کا گزر نہ ہوتا، نہ عیش باغ کے میلوں اور لکھنؤ کے مشاعروں کی ہماہمی دکھائی دیتی۔ اس لیے رسوا نے خانم کی دکان تلاش کی۔ اس دکان میں ہر قسم کا سامان تھا اور اس کے گاہک اس معاشرت میں دور و نزدیک پھیلے ہوئے تھے۔''(۸)

مولانا راشد الخیری بیسویں صدی کے اہم ناول نگاروں میں سے ہیں جنھوں نے زیادہ تر اصلاحی اور تاریخی ناول تحریر کیے۔ تاریخی ناولوں میں بھی ان کا موضوع مسلمان عورتوں کی معاشرتی زندگی ہے۔ انھوں نے نسوانی طبقہ کے مسائل اور ان کی ذہنی اور نفسیاتی کشمکش کو اپنے ناولوں کا موضوع بنایا۔ ان کے ناول ''شاہد رعنا'' میں دہلی شہر کی ایک خانہ بدوش طوائف کی آپ بیتی ہے جس میں اس کی زندگی کے بچپن سے لے کر پیری تک کے حالات و واقعات حقیقی انداز میں بیان کیے ہیں۔

ناول ''سعادت'' میں دہلی کی ایک تعلیم یافتہ، ذی شعور اور حسین طوائف کی شرمناک واقعاتِ زندگی کا قصہ درج ہے۔

''شرابِ عیش''، ''بہارِ عیش''، ''قمارِ عیش'' وغیرہ ناول طوائفوں کی روداد پر مبنی ہیں۔ ان ناولوں کے ذریعہ راشد الخیری معاشرے کی اصلاح کرنا چاہتے تھے۔ ان کا اب سے خاص مقصد یہ تھا کہ طوائفیں اپنی حقارت بھری زندگی سے نکل کر راہِ راست پر آ جائیں۔ یہ ناول اس عہد کے دلی کے ماحول کی حقیقی عکاسی کا نمونہ معلوم ہوتے ہیں۔

رسوآ کے بعد پریم چند کے یہاں علاقائیت کے عناصر دیکھنے کو ملتے ہیں۔ پریم چند نے اردو ناول میں ایک نئے باب کا اضافہ کیا۔ اسے خیالی اور اصلاحی دور سے اس صنف کو حقیقت کی ترجمانی کی طرف لے آئے۔ ان کے زیادہ تر ناول سماجی حقیقت کے بہترین نمونے ہیں۔ انھوں نے

مختلف موضوعات پر اپنا قلم اٹھایا اور اردو ناول کو انسانی زندگی کی حقیقت کی نئی جہتوں سے روشناس کرایا۔ یوں تو انھوں نے متعدد ناول لکھے لیکن ''میدان عمل''، ''گوشۂ عافیت''، ''چوگان ہستی'' اور ''گئودان'' خصوصی اہمیت کے حامل ہیں کیونکہ ان کے ان ناولوں میں کسی نہ کسی علاقے پر فوکس کر کے قصہ اور پلاٹ کا تانا بانا بنا گیا ہے۔ ''گوشۂ عافیت'' اپنے موضوع کے اعتبار سے پہلا ایسا ناول ہے جس میں شمالی ہند کے دیہات کی جھلک نظر آتی ہے۔ ہندوستانی دیہات کی اس قدر حقیقی ترجمانی ہمیں پریم چند سے قبل نہیں ملتی۔ اسی طرح ''چوگان ہستی'' اور ''میدان عمل'' میں علاقائی عنصر کی شناخت ہوتی ہے۔ ''چوگان ہستی'' میں ناول کی کہانی ایک گاؤں پانڈے پور کے ارد گرد گھوتی ہے۔ ناول کا مرکزی کردار سورداس نابینا ہے جو بھیک مانگ کر اپنا گزر کرتا ہے۔ ایک رئیس سیٹھ اس کی زمین خرید کر وہاں سگریٹ کی فیکٹری قائم کرنا چاہتا ہے لیکن وہ اس بات سے متفق نہیں کیونکہ اسے معلوم ہے کہ اگر گاؤں میں یہ کارخانہ قائم ہوا تو یہاں کے لوگ بے راہ روی کے راستے پر گامزن ہو جائیں گے۔ نشے کی لت لگ جائے گی اور بہو بیٹیاں بھی روزگار کے لیے یہاں آئیں گی جو ان کے لیے بالکل ٹھیک نہیں ہے۔ اس طرح یہ ناول 'پانڈے پور' علاقے کی عکاسی کرتا ہے۔

پریم چند کے ناولوں کا اصل موضوع کسانوں کی نفسیات اور ان کے روزمرہ کے مسائل ہیں جن کو انھوں نے نہایت صداقت کے ساتھ پیش کیا ہے۔ بقول قمر رئیس:

''پریم چند کے ناول اپنے عہد کے ان ہمہ گیر اور نو بہ نو تغیرات کی تاریخ ہیں اور اس عہد کی سماجی گھٹن، سیاسی اضطراب اور اقتصادی بدحالی کی جیتی جاگتی تصویر ہیں۔''(۹)

''گئودان'' ناول میں پریم چند نے شمالی ہند کے ایک گاؤں بیلاری کو ناول کا محور بنایا ہے۔ وہاں کا ایک معمولی کسان ہوری اور اس کے گھر کے افراد اس کہانی کے مرکز ہیں۔ بظاہر تو یہ زمیندارانہ نظام اور کسان کی خستہ حالت کی داستان ہے لیکن اس ناول میں اس گاؤں کے رہن سہن، بول چال، رسم و رواج کی عکاسی فطری طور پر کی گئی ہے۔ ناول کی کہانی کا محور ہوری، دھنیا، بیٹی روپا، سونا اور بیٹا گوبر ہے۔ اس وقت شمالی ہندوستان میں کسانوں کی جو حالت تھی وہ نہایت افسوس ناک تھی۔ پریم چند نے ہوری کے کردار کے ذریعہ اس عہد کے تمام بے زبان کسانوں کو زندگی بخشی جس سے یہ افراد اپنے اصل مقام کو پہچان سکیں۔ اس بابت علی سردار جعفری فرماتے ہیں:

''آنے والی نسلیں ان کرداروں کے ذریعہ سے اپنے ماضی کو جائیں گی اور کبھی اس نظام کو واپس نہیں آنے دیں گی جو ہوری کی جان لے لیتا ہے۔''(۱۰)

پریم چند نے ''گئودان'' میں کسانوں کی غریبی، پسماندگی، ان کا استحصال، جاگیردارانہ نظام کی بدعنوانیوں، مظالم اور زیادتیوں کو بیان کیا ہے۔ اس کے علاوہ ناول میں شہری اور دیہاتی طرز معاشرت کا حسین امتزاج بھی ملتا ہے۔ پریم چند نے ہندوستان کی سماجی زندگی کے تمام مسائل اس عہد کے پس منظر میں بیان کیے ہیں۔ پریم چند کے متعلق ہندی ادب کے ڈاکٹر اندرناتھ مدن لکھتے ہیں:

''ہندوستان کے کسانوں اور مزدوروں کی حقیقی تصویر کشی کر کے انھیں زندہ جاوید بنا دیا۔ انھوں نے نہایت مؤثر انداز میں دیہاتی زندگی اور

اس کے مسائل بیان کیے ہیں۔""(١١)

پریم چند نے ہی سب سے پہلے ہندوستانی کسان، مزدور اور محنت کش طبقے کی روزمرہ زندگی، اس کے مسائل، استحصال اور بنیادی ضروریات کو ناولوں میں جگہ دی۔ اپنے ناول ""گوشۂ عافیت"" میں بھی انھوں نے گاؤں کی طرزِ معاشرت کو کھیتوں، جھونپڑیوں اور چوپالوں کا ذکر کیا ہے۔ ان سبھی کو انھوں نے اس عہد کے سیاسی پسِ منظر میں پیش کیا ہے۔

جہاں ایک طرف پریم چند کے یہاں شمالی ہند کے دیہاتوں کی عکاسی کی گئی ہے وہیں پریم چند کے بعد کرشن چندر کے یہاں کشمیر اور بمبئی کی جھلک دیکھنے کو ملتی ہے۔ انھوں نے اپنے کئی ناولوں میں صوبہ کشمیر کو محور بنا کر اس کے پسِ منظر میں علاقائیت کو واضح کیا ہے۔ اپنے ناول ""شکست"" میں کرشن چندر نے کشمیر کے جاگیردارانہ نظام، وہاں کی عوام کا استحصال، بد حالی، معاشرے کی طبقاتی کشمکش، چھوا چھوت، روزگار کے مسائل، بہو بیٹیوں کی عصمت کی حفاظت کے مسائل، ان سب کو کرشن چندر نے ترقی پسند کے زاویے سے دیکھا اور ایک مخصوص علاقے کو background میں رکھ کر علاقائیت کا رنگ بھی دیا ہے۔ سماج میں قائم پرانے فرسودہ روایتی رسوم و رواج، مذہبی تنگ نظری اور روایتی بندشوں سے سماج کے مظلوم افراد کو بچانے کی کوشش کی ہے۔ کرشن چندر کے زیادہ تر ناول ایک مخصوص علاقے کی عکاسی کرتے ہیں۔

ان کا مشہور ناول ""طوفان کی کلیاں"" بھی کشمیر کے پسِ منظر میں لکھا گیا ہے۔ جس میں ہم کشمیر کے گاؤں کے رہنے والے لوگوں کے مسائل سے روبرو ہوتے ہیں۔ اس ناول میں کرشن چندر نے ڈوگرہ نظام شاہی کے مظالم، جبر اور ستم کی داستان بیان کی ہے۔ اس طرح اس ناول میں بھی علاقائیت کا رنگ نظر آتا ہے۔ اس کے علاوہ کرشن چندر نے کئی ناول بمبئی شہر کو مدِ نظر رکھ کر لکھے ہیں۔ وہاں چونکہ فلم انڈسٹریز قائم ہے اس وجہ سے وہاں طرح طرح کی بدگمانیاں، برائیاں، دھوکہ دھڑی، جنسی بے راہ روی، لڑکیوں کا جنسی استحصال، جسمانی دھندے وغیرہ معاشرے میں شامل تھیں۔ کرشن چندر نے اپنی زندگی کے کئی برس کمیٹی میں گزارے وہاں کے ماحول سے روبرو ہوئے تو انھوں نے ""پانچ لوفر ایک ہیروئن""، ""چاندی کا گھاؤ""، ""سڑک واپس جاتی ہے""، ""دادر پل کے بچے"" جیسے ناول تخلیق کیے۔ ""باون پتے"" بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے جس میں انھوں نے فلم انڈسٹری کی تمام برائیوں، غلاظت، چکا چوندھ اور دولت کی بربادی کو بیان کیا ہے۔ بہت سے نوجوان لڑکے لڑکیاں بمبئی میں فلموں میں اپنی قسمت آزمانے آتے ہیں مگر انھیں برسوں تک دھکے کھانے کے بعد بھی فلموں میں چھوٹے موٹے کردار بھی نہیں ملتے۔ فلموں میں موقع پانے کے لیے لڑکیاں عزت تک داؤ پر لگا دیتی ہیں تو کچھ دھوکہ کا شکار بن جاتی ہیں۔ ڈائرکٹر، پروڈیوسر خود بھی لڑکیوں کا استحصال کرتے ہیں۔ دولت منداپنی دولت شراب نوشی، سٹّے اور دیگر فحش کاموں میں اڑاتے ہیں۔ اس طرح کرشن چندر کا یہ ناول بمبئی اور وہاں کی فلم انڈسٹری کے ارد گرد گھومتا ہے۔ یہ ناول اس وقت کے فلم انڈسٹری کے حالات اور اس میں پھیلی بے راہ روی کی بخوبی عکاسی کرتا ہے۔

ناول ""ایک عورت ہزار دیوانے"" ایک قبیلے کی کہانی ہے جس کا مرکزی کردار لاچی ہے۔ یہ ایک خانہ بدوش قبیلے کی رہنے والی ہے جس کا کوئی

وطن، کوئی ٹھکانہ نہیں ہے۔ پورے ناول کا محور بھی یہی خانہ بدوش قبیلہ ہے۔ وہاں کا رہن سہن، رسوم وعقائد، بول چال، کھانا پینا، مخصوص لباس سب کا بیان کرشن چندر نے نہایت باریکی سے کیا ہے۔ ان کا ناول ''دادر پل کے بچے'' بمبئی میں رہنے والے غریب بچوں کی داستان ہے جو بھیک مانگ کر اپنا گزارا کرتے ہیں۔ انھوں نے اس ناول میں بمبئی جیسے بڑے صنعتی شہر میں بچوں کے استحصال کا ذکر کیا ہے۔ چھوٹے چھوٹے بچے بھیک مانگنے، ہوٹل میں برتن مانجھنے اور مزدوری کرنے کو مجبور ہیں کیونکہ پیٹ کی آگ کو بجھانا ہے تو جانے انجانے غلط ہاتھوں میں پڑ کر ان سرمایہ داروں کے جال میں پھنس جاتے ہیں۔ کرشن چندر نے ناول کے ذریعہ یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ تعلیم کا رشتہ روزگار سے نہ جڑے ہونے کے سبب بھی بچے تعلیم حاصل کرنے کے بجائے جاہل رہ کر کام دھندہ کرنا پسند کرتے ہیں۔ ناول میں ایک بچہ ایک مقام پر کہتا ہے:

''بی۔اے پاس کرنے والے دادر پوسٹ آفس کے باہر خط لکھتے ہیں اور دس آنے روز کماتے ہیں میں یہاں سٹّے سے دن میں دس روپے کما لیتا ہوں میں اسکول جا کر کیا کروں گا۔''[۱۲]

اس اقتباس سے ظاہر ہوتا ہے کہ تعلیم حاصل کر کے کوئی فائدہ نہیں ہے کیونکہ جاہل پڑھے لکھے انسان سے کئی گنا زیادہ کما رہا ہے لیکن بنا تعلیم کے نہ تو انسان میں شعور پیدا ہوتی ہے نہ ہی اسے زندگی جینے کا اصل ڈھنگ معلوم ہو پاتا ہے۔ اس ناول میں بمبئی کا اصل چہرہ ہمیں نظر آتا ہے۔

کرشن چندر کے بعد خواجہ احمد عباس کا ناول ''بمبئی رات کی بانہوں میں'' بمبئی شہر کی تصویر کشی نظر آتی ہے۔ اس میں انھوں نے وہاں کے لوگوں کی سنگ دلی، دولت کمانے کی ہوس اور وہاں کے فٹ پاتھوں پر رہنے والے بے بس لوگوں کی زندگی کو نہایت فطری ڈھنگ سے بیان کیا ہے۔

اس ضمن میں احسن فاروقی کا ناول ''شام اودھ'' خاص توجہ کا مرکز ہے۔ اس ناول میں انھوں نے اودھ کی مٹتی ہوئی تہذیب اور زوال آمادہ اقدار کو موضوع بنا کر پیش کیا ہے۔ اس ناول میں لکھنؤ کے نواب خاندان کو مرکز بنا کر اودھی تہذیب کی دم توڑتی ہوئی اقدار کو پیش کیا ہے۔ یہ ناول اودھ کی عکاسی کرتا ہے۔

اس کے بعد عزیز احمد کے ناول ''آگ'' میں ہمیں علاقائیت ملتی ہے۔ یہ کشمیر کے پسِ منظر میں لکھا گیا ہے۔ اس میں بیسویں صدی کے اوائل سے لے کر قیام پاکستان تک کے تقریباً ۳۷ برس کے زمانے کا احاطہ کیا گیا ہے جن میں ہندوستان کی اہم سیاسی تبدیلیوں یعنی مسلم لیگ، کانگریس اور کمیونسٹ پارٹیوں کی کارروائیوں کی حقیقی تصویر پیش کی ہے۔ یہ پہلا ایسا ناول ہے جس میں کشمیر کی حسین وادیوں کی آڑ میں چھپے جاگیردارانہ ظلم و ستم کے جہنم سے قاری روبرو ہوتا ہے۔ اس ناول میں خاص طور پر کشمیر کے ایک دولت مند سوداگر 'سکندر جو' کی زندگی پیش کی گئی ہے۔

اسی طرح ''ایسی بلندی ایسی پستی'' میں حیدر آباد کے نظام گھرانوں کی حقیقی عکاسی ہے۔ اس ناول میں عزیز احمد نے وہاں کے کئی نواب

خاندانوں کو محور بنا کر ان کی تہذیب و تمدن، ان کی تعیش پسندی، جنسی کجروی، ان کے رہن سہن کے طرائق پر روشنی ڈالی ہے۔ یہ ناول اس عہد کے حیدر آبادی نظام کی عکاسی کرتا ہے۔

اسی دور میں علاقائی ناول کے میدان میں راجندر سنگھ بیدی نے گراں قدر اضافہ کیا۔ ان کا ناول ''ایک چادر میلی سی'' اس روایت کو بڑھانے میں سنگِ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ ایک ایسا ناول ہے جسے ہم واقعی بنا کسی بحث کے علاقائی ناول کے زمرے میں رکھ سکتے ہیں۔ یہ ناول ہندوستان کے پنجاب خطہ کے ایک چھوٹے سے گاؤں کوٹلہ کی تصویر ہے جس کے ذریعہ بیدی نے پنجابی طرز معاشرت، بول چال، وہاں کے منفرد رسوم و عقائد پر روشنی ڈالی ہے۔ یہ ناول پنجاب میں رائج ایک مخصوص رسم 'چادر ڈالنے' پر منحصر ہے۔ راجندر سنگھ بیدی کا یہ واحد ناول ہے جس میں انھوں نے پنجاب کے نچلے طبقے کے لوگوں کے مسائل خاص کر مرد زدہ معاشرے میں عورتوں کے مسائل پر خاص روشنی ڈالی ہے۔ اس ناول میں علاقائی ناول ہونے کے سبھی نکات موجود ہیں۔ ناول مختصر ہے لیکن اس کا کینوس اور تہذیبی معنویت نہایت وسیع ہے۔ ''ایک چادر میلی سی'' میں ہم پورے پنجاب کو ہو بہو سامنے محسوس کرتے ہیں۔ پورا ناول خالص پنجابی رنگ لیے ہوئے ہے۔

قرۃ العین حیدر نے بھی اپنے ناولوں میں مخصوص علاقوں کے پسِ منظر میں کہانی بیان کی ہے۔ ان کا پہلا ناول ''میرے بھی صنم خانے'' میں جاگیر دارانہ عہد کی زوال آمادہ تہذیب کا ماتم اور اودھ کی معاشرتی زندگی کا نقشہ نہایت موثر انداز میں پیش کیا ہے۔ اس بارے میں وہ خود لکھتی ہیں:

''تہذیب کے مرکزوں اور گہواروں میں پلنے والے در بدر کی ٹھوکریں کھانے کے لیے صحراؤں کی طرف نکل گئے۔ امام باڑے ویران اور مسجد شکستہ ہو گئیں، پرانے خاندان مٹ گئے، زندگی کی پرانی قدر میں خون اور نفرت کی آندھیوں کی بھینٹ چڑھ گئیں، ایک عالم تہہ و بالا ہو گیا۔ وہ تہذیب ہندوؤں اور مسلمانوں کا معاشرتی اور تمدنی اتحاد روایات، وہ زمانہ سب کچھ ختم ہو گیا۔''(۱۳)

حالانکہ یہ ایک علامتی ناول ہے تاہم اس میں زوالِ اودھ کے بعد لکھنوی تہذیب کی حسین فضا نظر آتی ہے ساتھ ہی تقسیمِ ہند اور جنگِ عظیم کے المناک حادثات کا بیان بھی حقیقی انداز میں کیا ہے۔

اسی طرح ان کے ناول ''آخر شب کے ہم سفر'' میں انھوں نے بنگال کے انقلابی عوام کی داستان بیان کی ہے۔ اس کے متعلق پروفیسر عبد المغنی رقمطراز ہیں:

''اودھ کا خون قرۃ العین حیدر کی رگوں میں دوڑ رہا تھا، لیکن بنگال کی روح میں اتر کر انھوں نے اپنی ذہانت اور قوتِ تصور کا کارنامہ دکھایا ہے۔''(۱۴)

بیدی کی ہی طرز پر بلونت سنگھ نے بھی پنجاب کے دیہاتوں کو اپنے ناولوں کا موضوع بنایا۔ انھوں نے پنجاب کے دیہاتوں کی طرز معاشرت، رسوم و عقائد، وہاں کے خوبصورت قدرتی مناظر، کھیت کھلیان، لوگوں کا اکھڑ پن، عورتوں کی گھریلو زندگی ان سبھی موضوعات کو اپنے ناولوں میں سمیٹا ہے۔ انھوں نے کئی ناول تخلیق کیے جن میں ''رات چور اور چاند''، ''چک پیراں کا جسہ''، ''راکا کی منزل''، ''ایک معمولی لڑکی''

اہم ہیں۔ان کے زیادہ تر ناولوں میں پنجاب کا رنگ دیکھنے کو ملتا ہے۔انھیں پنجابی جاٹ سکھوں کا فکشن نگار بھی کہا جاتا ہے۔ناول ''رات چور اور چاند''میں بھی انھوں نے پنجابی زندگی کا احاطہ پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔بلونت سنگھ پنجابی دیہات کو پیش کرتے وقت وہاں کی زندگی میں حسن و دلکشی کو محسوس کرتے ہیں اور قاری کو بھی احساس کراتے ہیں۔اسی لیے شاید انھیں پنجاب نگار کہا گیا ہے۔ناول ''رات چور اور چاند''میں بلونت سنگھ نے ڈنگا گاؤں کے لوگوں کی بے لوث زندگی، وہاں کی خوشگوار فضا، موسم، رسم و رواج، کسانوں کی طرزِ زندگی اور ان کے مشاغل کو بڑی گہرائی کے ساتھ پیش کیا ہے۔اس لیے اس ناول کو بھی علاقائی ناول کہا جا سکتا ہے۔اسی طرح ''چک پیراں کا جسہ''میں بھی خطہ پنجاب کے ایک گاؤں کو محور بنا کر پیش کیا گیا ہے۔یہ دونوں ہی ناول خطہ پنجاب کی مخصوص طرزِ معاشرت کی عکاسی کرتے ہیں۔

اس کے بعد کئی ناول نگاروں کے ناول منظرِ عام پر آئے جن میں علاقائیت کے عناصر دیکھنے کو ملتے ہیں۔لیکن چونکہ ان میں خالص ایک علاقہ کا رنگ نہیں دوسرے موضوعات پر بھی زیادہ توجہ دی گئی ہے اس لیے انھیں خالص علاقائی ناول تو نہیں کہہ سکتے لیکن پھر بھی علاقائی ناول کچھ حد تک کہے جا سکتے ہیں۔ان میں عصمت چغتائی کا ''معصومہ''جس میں انھوں نے تمام مسائل کے ساتھ بمبئی کی فلم انڈسٹری میں موجود استحصال کی طرف پوری توجہ دی ہے۔یہ ناول ۱۹۶۲ء میں شائع ہوا۔اس میں عصمت ایک معصوم لڑکی کے سرمایہ دارانہ طبقے کی جنسی ہوس کے سبب اس کے کال گرل بن جانے کی المناک کہانی بیان کی ہے۔حیدرآباد میں زوال کے بعد معصومہ کا باپ گھر چھوڑ کر کراچی چلا جاتا ہے۔معصومہ کی ماں اور تین بھائی بہن اکیلے رہ جاتے ہیں۔ماں ان سب کو لے کر بمبئی آجاتی ہے۔ہمیشہ سے تعیش میں زندگی گزارنے والی معصومہ کی ماں زیادہ دن تک معصومہ کی عزت کی حفاظت نہیں کر پاتی اور اس کے ایک خیر خواہ احسان صاحب ہی مدد کرتے کرتے معصومہ کے دلال بن جاتے ہیں۔معصومہ کو طوائف بنانے میں سرمایہ دارانہ نظام ہی ذمہ دار تھا جو دولت کی طاقت سے لڑکیوں کی خریداری کرتے ہیں گویا وہ انسان نہیں بلکہ کوئی چیز ہے۔

حیات اللہ انصاری کا ''لہو کے پھول''میں تقسیم سے قبل اور بعد کے ہندوستان کی تہذیبی، معاشرتی اور سیاسی حالات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ حالانکہ یہ کافی ضخیم ناول ہے اور اس کا موضوع طبقاتی کشمکش، ہندو مسلم فرقہ واریت اور زمینداروں کا کسانوں پر ظلم و ستم اور زیادتی کرنا ہے۔ اپنے ناول ''گھروندا''اور ''مدار''میں حیات اللہ انصاری نے بنجاروں اور قبائلی لوگوں کی زندگی کی جدوجہد اور مسائل کو پیش کیا ہے۔اسی کڑی میں قرۃ العین حیدر کا ''آخر شب کے ہم سفر''صوبہ بنگال کے متعلق ہے۔ناول کے پسِ منظر میں پورا بنگال ہے لیکن ناول کا اصل موضوع تحریکِ آزادی ہے۔لیکن یہ ناول پھر بھی علاقائیت کی شناخت کرنے سے اس زمرے میں شامل ہوتا ہے کیونکہ ناول کی فضاء کردار، بول چال، پسِ منظر سبھی کچھ بنگال کے صوبہ کے ارد گرد ہی نظر آتا ہے۔

اس روایت میں فضل احمد کریمی کا ناول "خون جگر ہونے تک''خاص اہمیت کا حامل ہے۔یہ ناول فضل احمد نے اس وقت تخلیق کیا جب کہ زیادہ تر ناول نگار اس وقت شمالی ہند کے اتر پردیش یا پنجاب کو ہی اپنے ناولوں کا موضوع بنا رہے تھے۔اس وقت فضل نے صوبہ بنگال کے مشرقی حصے کی تہذیب و معاشرت کو ناول کا موضوع بنایا۔اس ناول کا موضوع قحط بنگال ہے۔یہ اپنی نوعیت کا پہلا ایسا ناول ہے جس میں قحط

کے سبب ہوئی تباہی، بربادی، بھوک مری کا المناک منظر کھینچا گیا ہے۔ لیکن کہیں تو منظر اتنا المناک ہو گیا ہے کہ ہمدردی اور ایثار کا جذبہ چھلک اٹھتا ہے۔ فضلی نے بنگال میں بیس برس ٹھہر کر وہاں کی دردناک حقیقتوں اور دل سوز حالات کو خود محسوس کیا اور ناول میں اس کی حقیقی ترجمانی کی۔ اسی لیے اس ناول کو علاقائی ناول کے زمرے میں رکھا جا سکتا ہے۔

اس کے بعد ناول کے میدان میں کئی ناول نگاروں نے طبع آزمائی کی۔ کئی عمدہ ناول منظرِ عام پر آئے لیکن علاقائیت کے عنصر ذرا کم ہی دیکھنے کو ملے۔ پھر علیم مسرور کا ناول ''بہت دیر کر دی'' میں بمبئی شہر کی گہما گہمی بھری زندگی اور مصروفیات اور معاشرتی مسائل پر فوکس کیا ہے۔ اس ناول کی سب سے خاص بات یہ ہے کہ ایک طوائف کو بے حد شریف آدمی سے نسب کر کے یہ ناول تخلیق کیا گیا ہے جو کہ بالکل نیا تجربہ تھا۔ یہ ان کا پہلا اور آخری ناول ہے۔ علیم مسرور نے اس موضوع کو جدید زمانے کے تناظر میں مخصوص نظریہ کے ساتھ پیش کیا ہے۔ داؤد ایک نہایت شریف انسان ہے۔ وہ بمبئی میں ایک کھولی کا متلاشی ہے۔ اسی تلاش میں اس کی ملاقات ایک طوائف سلطانہ سے ہوتی ہے جو غنڈے کریم کے خوف سے بھاگ رہی ہے اور آخر میں داؤد سے ٹکرا جاتی ہے اور دونوں ایک ساتھ رہنے لگتے ہیں۔ سلطانہ جو کہ طوائف ہے، داؤد کا ساتھ پا کر اس کے دل میں ازدواجی زندگی بسر کرنے کی خواہش پیدا ہونے لگتی ہے اور دونوں ایک دوسرے کی محبت میں گرفتار ہو جاتے ہیں۔

علیم مسرورؔ نے اس نازک موضوع کو بمبئی جیسے شہر کے پسِ منظر میں پیش کیا ہے۔ اگر کسی اور شہر کے پسِ منظر میں یہ موضوع پیش کیا جاتا تو شاید یہ بیان اتنا فطری نہ ہوتا۔ بہر حال علیم مسرورؔ نے بڑی مہارت فین کا ثبوت دیا ہے۔

دورِ حاضر میں بھی بہت ناول لکھے گئے ہیں جن میں علاقائی شناخت ملتی ہے۔ جس میں جیلانی بانوؔ کا ''ایوان غزل'' ناول کا موضوع سقوط حیدر آباد ہے۔ ناول کا کینوس حیدر آباد ہے۔ پورا ناول حیدر آباد کے خستہ حال، ٹوٹے بکھرے جاگیردارانہ نظام اور تہذیبی اقدار کی زوال آمادہ تصویر ہے۔

عبد الصمدؔ کا ''دو گز زمین'' اور ''دھمک'' بہار کے سیاسی پس منظر میں لکھے گئے ہیں جس میں صوبہ بہار سے شروع ہو کر بنگلہ دیش تک کی عکاسی کی گئی ہے۔

''دھمک'' میں انھوں نے بہار کے سیاسی پسِ منظر میں وہاں رائج کرپشن، سیاسی بدعنوانیوں کے بیچ سسکتے ہوئے انسان کی تصویر کشی کی ہے۔

اسی دوران پیغام آفاقی کا ناول ''مکان'' ۱۹۸۹ء میں شائع ہوا جس کا موضوع منفرد تھا۔ بمبئی دہلی جیسے بڑے شہروں میں مکان کی بڑی دشواری ہے اور جس کا ذاتی مکان ہے اگر وہ کرائے دار رکھ لیتا ہے تو مکان خالی کروانا بڑا ہی مشکل کام ہے۔ کیونکہ جب سے کرایہ داروں کے حق میں قانون بن گیا ہے تو مکان مالک مظلوم ہو گئے ہیں۔ انھیں اپنی ہی چیز کو حاصل کرنے کے لیے کچہری کے چکر کاٹنے پڑتے ہیں۔ ایسی ہی کچھ کہانی اس ناول کی ہے۔ نیرا ایک ایسی ہی شریف میڈیکل سائنس کی طالبہ ہے۔ گھر کی ساری ذمہ داری اسی کے کندھوں پر ہے۔ اس کا مکان کرایے پر ہے۔ والد کی موت کے بعد وہ ایک تاجر کو گھر کرائے پر دیتی ہے جو چالبازی سے دلال اشوک کی مدد سے نیرا کے پورے گھر پر

قبضہ کر لیتا ہے۔ نیرا اس کے خلاف عدالت میں مقدمہ لڑتی ہے۔ نیرا کی بات کوئی نہیں سنتا۔ لیکن پھر بھی وہ ہمت نہیں ہارتی۔ آخر تک لڑتی ہے اور آخر کار مکان واپس حاصل کر لیتی ہے۔ اس طرح پورا ناول دہلی شہر کی فضا سے پُر ہے۔

علی امام نقوی کا ناول ''تین بتی کے راما'' بھی بمبئی کے پس منظر میں لکھا گیا ہے۔

اس کے علاوہ علاقائی ناولوں میں الیاس احمد گدی کا ''فائر ایریا'' سب سے زیادہ اہمیت کا حامل ہے۔ اس میں انھوں نے کول مائن میں کام کرنے والے مزدوروں کی زندگی، خستہ حالی اور ان کے استحصال کو بیان کیا ہے۔ ان کا رہن سہن، خاص طرز معاشرت، ان کے مسائل کا نہایت باریک بینی سے بیان کیا ہے۔ اسے خالص علاقائی ناول کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔

اس ضمن میں صوبہ بہار پر حسین الحق نے دو ناول لکھے۔ ایک ''فرات'' دوسرا ''بولو مت چپ رہو''۔ دونوں ہی بہار کے پس منظر میں لکھے گئے ہیں۔ ''فرات'' بہار کے متوسط طبقے کے مسلم گھرانوں کی داستان ہے جبکہ ''بولو مت چپ رہو'' تعلیمی نظام میں پھیلی بد نظامی پرائمری اور سیکنڈری اسکولوں کے اعلیٰ افسروں کی تاناشاہی، ہر بات پر رشوت لینا اور چھوٹی چھوٹی باتیں جو بہار کے تعلیمی نظام کو ابتدائی سطح پر کھوکھلا بنا رہی ہیں انھیں منظرِ عام پر لایا گیا ہے۔ اس ناول میں بہار میں پھیلی نکسل تحریک کا سماج پر اثر بھی دکھایا گیا ہے۔ غرضیکہ ناول کا محور بہار ہی ہے۔ اس کے علاوہ ترنم ریاض کا ''برف آشنا پرندے'' بھی اہمیت کا حامل ہے جو کہ کشمیر کے پسِ منظر میں لکھا گیا

حاصل بحث

اس ضمن میں ایک اور ناول خاص توجہ کا حامل ہے۔ ''یہ پھول خاموش تھا'' یہ نقش قمر بندی کا ناول ہے جو کہ یوپی کے چھوٹے سے شہر اناؤ کے پسِ منظر میں لکھا گیا ہے۔ اس میں وہاں کی روز مرہ زندگی، رہن سہن، بول چال کو بالکل ہو بہو بیان کیا گیا ہے۔ چونکہ اناؤ پہلے کانپور شہر کا ہی ایک حصہ تھا۔ کچھ برس قبل اسے الگ ضلع کا درجہ ملا ہے اس لیے ابھی وہاں کی زیادہ آبادی دیہات میں ہے۔ اس ناول میں نقش قمر بندی نے دیہی علاقے کی عکاسی بخوبی کی ہے۔ پریم چند کے بعد اس ناول میں ہمیں یوپی کو سطحی طور پر دیکھنے کا موقع ملتا ہے۔ کم و بیش اردو ادب میں یہی ناول ہیں جن میں ہمیں علاقائیت دیکھنے کو ملتی ہے۔ اگلے باب میں خاص خاص علاقائی ناولوں کا صوبوں کے اعتبار سے تفصیلی جائزہ لیا جائے گا۔

حوالہ جات

1. The Novel and the People, Ralph Falx, P.74
2. Western Man and Literature, J.B. Priestly, P.223
3. Dr. Yousif Sarmast, Besveen Sadi Mein Urdu Novel, New Dlhi, 2000, P.26,
4. Pro. Iftkhar Ahmed Siddiqe, Dybaja, Fasana mubtala, P. 30
5. Ali Abbas Hussaini, urdu Naval ki Tareekh aor Tankeed, Educational book house, Aligrah , P. 250.
6. Zareena Aqeel, sawra Lahore, Shomara june 1938, Ba- hawala Urdu Naval mi Socialism, Israr Kareemi Pariss, Allah Abad, 1984. P. 260.
7. Ahtsham Hussain, Urdu Adbab ki Tankeedi Tareekh, Tariki urdu biro, Nai Delhi, 1983. P. 205.

8. Pro. Khursheed-ul-Islam, Tankeedie, Educational book House Aligrah, 1977. P. 100.
9. Dr. Qmar Rais, Pareim Chand ka Tankeedi Motala, Sir, Syed Book Dipoo, Aligrah, 1963, P. 90.
10. Ali Sardar Jaffari,Tareeki Pasand Adab, Anjman Tareeki urdu (Hindi) Aligrah. 1951.P.136.
11. Dr. Indra Nath Mudan, Pareim Chand, Aik Voochin(Hindi), P. 84.
12. Karishan Chandr, Dadreple Ky Bachay, Asia Publishers, Delhi, 1941. P. 406.
13. Qorat-ul- Ain Haider, Meray Bhi Sanim Khanee, Mktb Jadeed, Lahore, 1949. P. 402.
14. Pro. Abdul Ghani, Qorat-ul- Ain Haider ka Fan, Modern publishing House, Delhi, 1990. P. 106.